نطشےؒ خدا کو اخلاقی نظام سے تعبیر کرتا ہے' اور کائنات کو اس وجود کے ظہور فی الخارج سے تعبیر کرتا ہے انسانیت اس کی رائے میں المطلق کا ازلی ظہور ہے۔

یہ بات بھی لائق تذکرہ ہے کہ نطشےؒ عیسائی مذہب کے عقیدۂ تجسّم کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی رائے میں ہر شخص مظہرِ صفات باری تعٰی ہے۔ مسیح ابن مریم کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ ہر شخص میں ایزدی صفات پوشیدہ ہیں۔[1]

نوٹ: اقبال نے اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" کا آغاز حسبِ ذیل اشعار سے کیا ہے جو نطشےؒ کے فلسفۂ خودی کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ اقبال کا فلسفۂ خودی نطشےؒ سے ماخوذ ہے:

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
در جہاں تخم خصومت کاشت است — خویشتن را غیرِ خود پنداشت است
سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذّتِ پیکار را

خلیفہ عبد الحکیم کا خیال بھی یہی ہے چنانچہ ترجمان الاسرار کے دیباچے میں ص۲۲ پر لکھتے ہیں:
" اقبال مشہور جرمن فلسفی نطشےؒ کا ہمنوا ہو کر کہتا ہے کہ کائنات کا وجود (پیکرِ ہستی) خودی (EGO) ہی کا نتیجہ ہے ماسویٰ کا وجود، خدا کی خودی سے سرزد ہوا ہے۔"

کانٹ کی طرح نطشےؒ بھی تثلیث، تجسّم اور کفّارۂ مسیح کا قائل نہیں تھا، اسی لئے جرمنی اور

---

[1] میرا ذاتی مسلک بھی یہی ہے کہ ہر شخص کے نہاں خانۂ قلب میں تجلّیٔ حسنِ یار پوشیدہ ہے۔ چونکہ ہم پردہ ہٹانا نہیں جانتے (جب سیکھتے نہیں تو ہٹانے کا طریقہ آئے بھی کیسے؟) اس لئے درشن کے بغیر ہی اس دارِ امتحان سے رخصت ہو جاتے ہیں اور چونکہ ؏ زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش: اس لئے مرنے کے بعد درحقیقت مر جاتے ہیں:

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا

خصوصاً 'JENA' کے پادریوں نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا جس کی وجہ سے اسے یونیورسٹی کی ملازمت ترک کرنی پڑی۔

واضح ہو کہ انیسویں صدی میں کوئی شخص عیسائیت کا انکار کرنے کے بعد یورپ کی کسی یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز نہیں رہ سکتا تھا۔

شیلنگ (۱۷۷۵ - ۱۸۵۴) نے اپنی فلسفیانہ زندگی کا آغاز فشٹے کے شاگرد یا متبع کی حیثیت سے کیا لیکن جس طرح فشٹے نے کانٹ سے اختلاف کیا، اسی طرح شیلنگ نے اپنے استاد کے افکار پر قناعت نہیں کی بلکہ فطرت کے اس پہلو پر غور کیا جو فشٹے کی نگاہ سے اوجھل رہ گیا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے جو نظریہ پیش کیا وہ فشٹے کے فلسفے کی ضد ہے۔ یعنی موضوعی تصوّریت کے بجائے معروضی تصوّریت (OBJECTIVE IDEALISM)۔

فشٹے نے کہا تھا کہ ایغو (خودی) ہی سب کچھ ہے یا ہمہ ہے۔ شیلنگ نے اس کے مقابلے میں یہ کہا کہ ہمہ ہی ایغو ہے۔ یعنی المطلق جس طرح اپنے آپ کو عالم روح میں ظاہر کرتا ہے اسی طرح عالمِ فطرت میں بھی ظاہر کرتا ہے۔

فشٹے نے عالمِ محسوس کو عالم وراء المحسوسات کے تابع کر دیا تھا اور اس کی حیثیت محض ضمنی رہ گئی تھی۔ شیلنگ نے دونوں عالموں کو باہم دگر مربوط کر دیا اور دونوں کو یکساں لائقِ توجہ قرار دیا اور دونوں کی اہمیت تسلیم کی۔

چنانچہ شوپن ہار کا یہ قول صداقت سے بہت نزدیک ہے کہ شیلنگ کے فلسفے کا مقصد، تصوریت (عالم روحانی، IDEALISM) اور خارجیت (عالمِ جسمانی، REALISM) میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا اور اسی لئے اکثر ناقدوں کا خیال ہے کہ شیلنگ نے فشٹے کے بعد اسپنوزا کے خیالات سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔

بہرحال شیلنگ نے خدا کا جو تصوّر پیش کیا وہ یہ ہے کہ خدا اپنے آپ کو عالمِ فطرت، تاریخِ عالم اور حیاتِ عالم میں ظاہر کرتا ہے۔ وہ عالمِ فطرت میں اپنے آپ کو جزوی طور پر اور شعورِ انسانی میں کلی طور پر ظاہر کرتا ہے۔ شیلنگ کا یہ قول قابلِ غور ہے کہ "فطرت ذہنِ مشہود ہے اور ذہن،

© rasailojaraid.co

فطرت غیر مشہود ہے۔"

فشتے کی طرح شیلنگ بھی تجسّمِ مسیح کے نصرانی عقیدے کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسانیت بحیثیت انسانیت، مظہرِ ذاتِ باری ہے۔ مسیح ابن مریم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

جرمنی میں گوئٹے نے اور انگلستان میں کالرج نے شیلنگ کے فلسفیانہ افکار سے بہت اثر قبول کیا۔

ہیگل (۱۷۷۰ - ۱۸۳۱)

کانٹ نے تصوّریت کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا اس کی تکمیل ہیگل کے فلسفۂ تصوّریتِ مطلقہ کی صورت میں ہوئی۔ عصرِ حاضر میں اس کے فلسفے کی عظمت کا آفتاب اگرچہ گہنا گیا ہے تاہم حامیانِ فلسفۂ تصوّریت کی نگاہ میں اس کی عظمت بدستور قائم ہے۔

ہیگل اپنے شاہکار "لاجک" (LOGIC) میں اپنے نظامِ فکر کے بنیادی تصوّر کو بایں الفاظ پیش کرتا ہے کہ "وہ وحدت جس کی طرف تمام اشیائے کائنات رجوع کرتی ہیں، ایک روحانی اور صاحبِ شعور اصل ہے[۲]۔" (یہ وحدت الوجود کی ایک خاص تعبیر ہے)۔

ہیگل اپنے دعوے کو بایں طور ثابت کرتا ہے کہ ہر وہ مقولہ جس کے ذریعے سے کائنات کی توجیہہ کی جاتی ہے مثلاً علّت، قانون، جوہر، وجود وغیرِ ذالک۔ یہ سب فکر کے مختلف اوصاف ہیں اور جب ان کی وضاحت کی جاتی ہے تو شعورِ ذات کا قاعدہ ضمناً ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہیگل کہتا ہے کہ "المطلق" مادہ نہیں ہے بلکہ روح ہے"۔ لیکن یہ روحانی ہستی اپنی ذات کا شعور صرف اس طرح حاصل کر سکتی ہے کہ پہلے اپنے آپ کو، اپنے آپ سے خارج میں

---

۱ اقبالؒ نے ہیگل کے فلسفے کو "طلسم" سے تعبیر کیا ہے:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی

۲ میری رائے میں، اس فقرے میں ہیگل نے وحدتِ وجود کے بحر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہی بات فلاطینوس، اسپنوزا، برونو، فشتے، شیلنگ، بریڈلے، شیخ اکبر، جامی، رومی، بیدل، ملا بحر العلوم، خاتم الحکما مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے تمام شاگردوں نے اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے الفاظ میں بیان کی ہے۔

کثرتِ ایں نقش ہا عرضِ تجلی ہائے اوست — در دو عالم غیر یک نقاش کس موجود نیست

(حضرت جانجاناں مظہر شہیدؒ)

متصوّر کرے (از خود بیروں رود) تاکہ وہ خود ہی معروض (OBJECT) بن سکے یعنی وہی ایک ذات ہے جو موضوع بھی ہے اور معروض بھی۔ صرف اسی صورت سے ذاتِ احدیت کو اپنا شعورِ ذات حاصل ہو سکتا ہے [1]

ہیگل کے نزدیک المطلق نہ تو شیلنگ کے المطلق کی طرح ایک تجریدی عینیت ——— (ABSTRACT IDENTITY) ہے اور نہ اسپنوزا کے قول کے مطابق ایک جامد جوہر ہے جس میں سارے امتیازات ضم ہو جاتے ہیں بلکہ وہ ایک زندہ روح ہے اور ایک تخلیق کرنے والی ہستی ہے جس کی ماہیئت زندگی اور حرکت اور ارتقار ہے اور یہ ارتقاء کثرت سے وحدت کی طرف ہوتا ہے۔ اور اسی سے تمام محدود اشیار خارج میں ظاہر ہوتی ہیں اور متحقق ہوتی ہیں اور اسی ذات میں تمام اختلافات ظاہر ہوتے ہیں اور انجام کار سب اختلافات ایک وحدت میں مبدل ہو جاتے ہیں جس طرح

ع ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد [2]

دراصل ہیگل دوگونہ حرکت کو تسلیم کرتا ہے۔ ایک حرکت اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف، دوسری حرکت ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف۔ بالفاظِ دیگر ایک حرکت غیر محدود سے محدود کی طرف، دوسری، محدود سے غیر محدود تک۔

خدا اپنے آپ کو کائنات میں ظاہر کرتا ہے، اور یہ کائنات انسان کی محدود روح میں، دوبارہ اپنا شعور حاصل کرتی ہے۔ لہٰذا یہ کائنات روحِ مطلق کا ارتقار یا "ذاتِ باری کی توضیح" تاریخ، انسانی تجارب کے سلسلوں کے ذریعے سے، ذاتِ الٰہی کے تحقق ذاتی کا نام ہے۔

---

[1] واضح ہو کہ افلاطون سے لے کر ہیگل بلکہ بریڈلے تک تمام وجودی حکمائے نے تصوّف ہی کی زبان میں گفتگو کی ہے جب کوئی دوسری ہستی موجود نہیں ہے تو الواحد اس کے سوا اور کیا کرے کہ پہلے خود ہی منظور بنے، پھر خود ہی ناظر بنے۔ خود ہی مشہود بنے خود ہی شاہد بنے ——— وحدت الوجود خواہ یونانی ہو یا ہندی، ایرانی ہو یا اسلامی، اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ دوسری ہستی موجود نہیں ہے۔

[2] رومی بھی یہی کہتے ہیں:

صبغۃ اللہ ہست رنگ خُم ہو پیسہ ہا یک رنگ گردد اندر او

© rasailojaraid.com

کائنات میں ہر جگہ ایک نظم سر گونہ کارفرما نظر آتا ہے یعنی قضیہ (THESIS) تناقض (ANTI-THESIS) اور تالیف (SYNTHESIS) جس طرح خود ذاتِ مطلق میں، اسی طرح فطرت، انسان اور تاریخ میں، اسی طرح مذہب، آرٹ اور فلسفے میں یہ سہ گانہ طریق عمل کارفرما ہے۔ وحدت میں کثرت، کثرت میں وحدت ترقی پذیر تغیر داتیاز و وحدت د اختلاف و ہم آہنگی و مصالحت۔ یہی اس کائنات کی نبض ہے بلکہ یہی خدا کا جوہر ذات اور سرّالاسرار ہے۔ ہر جگہ فکر کی جلوہ فرمائی ہے اور یہی فکر، حقیقت کی ہئیت یا صورت کی ضامن ہے۔ بالفاظِ دگر" وہی حقیقی ہے جو عقلی یا فکری ہے اور جو عقلی ہے یا فکری ہے، وہی حقیقی ہے "۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ہیگل کا فلسفہ ایک قسم کی الہٰیات ہے۔ اس نے یہ کوشش کی ہے اور اس کی یہ کوشش بہت عالمانہ ہے کہ وہ تمام حقیقت کا تصوّر، اصولِ فکر کے ظہور کی حیثیت سے کرے۔ اور یہ اصولِ فکر خود خدا کے ذہن کا جوہرِ ذات ہیں۔ اس بات کا ثبوت اس کے " فلسفۂ مذہب پر خطبات " سے مل سکتا ہے جو تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطبات میں اس نے حسبِ ذیل نکات بیان کئے ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہیں:

۱۔ مذہب انسان کی خصوصیت ہے اور اس کا امتیازی عنصر ہے۔ باقی جملہ حیوانات اس سے محروم ہیں۔

۲۔ یہ انسانی روح کا وہ وظیفہ ہے جس کے وسیلے سے انسان اپنے آپ اور خدا دونوں کو جان سکتا ہے۔

۳۔ مذہب، انسانی فکر میں متناہی اور لامتناہی کے اتحاد کا دوسرا نام ہے۔

۴۔ خدا اور انسان مماثل ہیں۔ وہ اپنی ماہئیت کے اعتبار سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقی یا باطنی وحدت ہیں۔

۵۔ خدا کسی ایسے وجود کا مبہم مشاہدہ نہیں ہے جو ہماری دنیا سے دور کسی غیر معلوم دنیا میں خلوت گزیں ہے اور نہ وہ ایک غیر معلوم یا برائے بیت ہستی ہے۔

ہیگل نے ان خطبات میں ان قیود یا حدود کو مٹانے کی کوشش کی ہے جو فلسفے نے مذہبی غور و فکر میں عائد کر دی تھیں۔ اور اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری تمام فکر جب

وہ علم کی گرفت میں آتی ہے، ہمارے زاویۂ نگاہ سے ذہنِ انسانی کا خدا کی طرف ترفع ہے۔ یعنی ہم بذریعہ تفکر، خدا کا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔ اور خدا کے زاویۂ نگاہ سے یہ ہماری فکر، دراصل خدا کی طرف سے اس کی اپنی ذات کا اظہار ہے اور یہ اظہار لاتعداد صورتوں میں ہو رہا ہے۔ گویا ہر حادثے سے[1] خدا ظاہر ہو رہا ہے۔

ہیگل نے ان خطبات کی دوسری جلد میں عیسائیت کو "مذہب مطلق" قرار دیا ہے۔

میں اس باب میں ہیگل سے شدید اختلاف کرتا ہوں۔ میری تحقیق کی رو سے موجودہ عیسائیت "مذہب مطلق" (THE ABSOLUTE RELIGION) تو کیا ہوتی، سرے سے کوئی قابلِ اعتنا مذہب ہی نہیں ہے۔ وہ دراصل قدیم ایرانی مذہب متھرائیت اور ہندی مذہب بودھ دھرم اور قدیم مصری مذہب نوفلاطونیت کا ملغوبہ ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیکن اس مقالے کا مقصد ہیگل کے اس غلط دعوے کی تردید نہیں ہے۔ اس لئے میں صرف اس قدر کہہ کر آگے بڑھتا ہوں کہ کانٹ کی طرح ہیگل بھی ملکی قانون سے خوف زدہ تھا۔ اگر وہ عیسائیت پر صحیح تنقید کرتا ہے تو نوکری[2] سے ہاتھ دھونے پڑ جاتے۔

فی الجملہ ہیگل نے عیسائیت کو کامل مذہب قرار دے کر اپنے مخالفین کا منہ بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے یہ کہہ کر کلیسا کو بھی خوش کر دیا کہ میں صدقِ دل سے تثلیث پر ایمان رکھتا ہوں۔

لیکن المانیہ کے اس سب سے بڑے فلسفی نے تثلیث کی جو تعبیر پیش کی، اس نے کلیسائی

---

[1] یہ کیا پوچھتے ہو کہ کیا ہو رہا ہے
خدا تھا، خدا ہے، خدا ہو رہا ہے (اکبر)

[2] یہ نوکری بھی عجیب شے ہے، یہ دراصل غلامی کی ایک ترقی یافتہ یا مہذب شکل ہے۔ چونکہ راقم الحروف ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء تک اس نعمت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس لئے اس کی خوبیوں سے بخوبی واقف ہے جب تک ضمیر اس دیوی کے چرنوں میں بطور نذرانہ پیش نہ کیا جائے یہ اپنے پجاری کو نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھتی۔

© rasailojaraid.com

عقیدۂ تثلیث کا خاتمہ بالخیر کر دیا یعنی تثلیث کے بجائے توحید کا اثبات کر دیا جس کی تشریح یہ ہے :-

ہیگل کہتا ہے کہ ہم خدائے واحد کو اس اعتبار سے کہ وہ ازل سے از خود موجود ہے، باپ کہتے ہیں۔ اور جب وہ خالق کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو ہم اسے "بیٹا" کہتے ہیں۔ اور جب وہ خالق کی حیثیت سے اپنی اصلی حیثیت کی طرف راجع ہوتا ہے۔ یعنی جب اسے اپنے خدا ہونے کا کامل شعور حاصل ہو جاتا ہے تو ہم اسے "روح القدس" کہتے ہیں۔

فائدہ جن لوگوں نے تاریخ کلیسا اور تاریخ عقائد عیسوی کا مطالعہ نہیں کیا ہے، ان کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ہیگل کی تعبیر کی رُو سے تثلیث، توحید میں مبدّل ہو جاتی ہے، "خدا تین میں ایک اور ایک میں تین" نہیں ہے بلکہ صرف ایک ہے جو تین مختلف حیثیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں نے تاریخ عقائد عیسوی کا مطالعہ کیا ہے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ تیسری صدی عیسوی میں 'SABELLINS' (سبے لی انس) نے جو افریقیہ میں اسقفِ اعظم تھا، بالکل یہی بات کہی تھی کہ خدا ایک ہے۔ باپ، بیٹا اور روحِ قدس یہ تین اشخاص یا اقانیم نہیں ہیں بلکہ اسی خدائے واحد کی تین حیثیات ہیں۔ جیسے زید ایک شخص ہے مگر وہ کسی کا بیٹا ہے، کسی کا باپ ہے اور کسی کا دوست ہے۔ یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ خدا ایک بھی ہو اور تین بھی ہو یا تین اشخاص بیک وقت جداگانہ بھی ہوں اور تینوں ایک بھی ہوں۔ بہر حال کلیسا نے اسے معزول کر دیا اور اس کے عقیدۂ توحیدِ ذاتِ باری کو کفرِ صریح قرار دیا۔

تاریخ کلیسا کے مطالعے سے واضح ہے کہ اگرچہ کلیسا نے تلوار کے زور سے اس عقیدے کو مدارِ نجات اور یسوع مسیح کی اصلی تعلیم قرار دینے میں کامیابی حاصل کر لی لیکن تیسری صدی سے آج تک کسی عیسائی فلسفی یا منطقی نے اسے تسلیم نہیں کیا بلکہ عصرِ حاضر میں تو بہت سے کلیسائی عہدے داروں مثلاً ڈاکٹر ریشڈل، ڈاکٹر بارنس و ڈاکٹر میجر وغیرہم نے بھی اس خلافِ عقل عقیدے سے اپنی برأت کی ہے۔ ہیگل کی تعبیرِ تثلیث حسب ذیل ہے:

خدا بحیثیت غیر مقید تجرید، باپ ہے۔

وہی خدا بحیثیت مقیدِ حقیقت، بیٹا ہے۔
اور وہی خدا بحیثیت عینیت مابین اب و ابن، روح القدس کے نام سے موسوم ہے۔
ہیگل کی وفات کے بعد، اس کے نظام کی عقلیت کے نتیجے میں، اس کے شاگردوں نے اس کے فلسفے کی مختلف تعبیرات پیش کرنی شروع کیں اور بائیں بازو نے مسیحیت کے ساتھ ساتھ مذہب اور خدا کا بھی انکار کر دیا۔ مثلاً اسٹراس نے "حیاتِ یسوع" میں یہ ثابت کیا کہ یسوع ایک فرضی انسان تھا اور (LUDWIG FENER BACK ۱۸۰۴ - ۱۸۷۲ء)
نے "روحِ مسیحیت" (۱۸۴۹ء) میں مسیحیت اور خدا دونوں کی تردید کر دی اور خدا کے بجائے انسانیت کو معبود و شرف کا مستحق قرار دیا۔ اسی تصور پر کانگٹ نے "مذہبِ انسانیت" کا قصر تعمیر کیا۔
"روحِ مسیحیت" کا انگریزی ترجمہ ۱۸۵۵ء میں مس میری ایوانس (جارج ایلیٹ) نے شائع کیا تھا۔
ہیگل کے فلسفے کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ اس کی زد، براہِ راست مذہب پر پڑتی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ المطلق (THE ABSOLUTE) کو اس حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کہ وہ انسانی زندگی میں خدا کا ظہور ہے اندریں صورت مذہب میں کمال اور حتمیت کے تصور کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، خدا کا ظہور نہ ابھی تک کامل یا ختم ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ایسا ہو سکے گا۔
اگر زندگی ادنےٰ مرتبے سے اعلیٰ مرتبے کی طرف ایک مسلسل ارتقائی حرکت کا نام ہے تو یہ ناممکن ہے کہ تاریخی طریقِ عمل میں کبھی بھی خدا کے کامل ظہور کا موقع آ سکے۔ ہمارے فکری طریق عمل کی غیر محدودیت، بقید زمان و مکاں، دوامی ترقی کی متقاضی ہے۔ لہٰذا یہ حرکت کسی نقطے پر ختم نہیں ہو سکتی۔

(ب) ہیگل وجود اور عدم (BEING & NON-BEING) دونوں کو عین یک دگر قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف "المنطق" میں (جو دراصل مابعد الطبیعات سے بحث کرتی ہے) یہ واضح کیا ہے کہ وجود بحت (PURE BEING) اپنی بحتیت یا صرفیت کی وجہ سے غیر مقید اور غیر مشروط ہے (یعنی لابشرط شئ کے درجے میں ہے)، لیکن جو شئ احوال یا شروط سے بالکل معرّیٰ ہو۔ اسے موجود نہیں کہہ سکتے (اس کی ہستی ثابت نہیں ہو سکتی) بالفاظ دیگر وہ محض ایک تجرید ہے جس کا وجود خارج میں متحقق نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو خالص تجرید ہے

© rasailojaraid.com

ہم اسے لاشئ (NOTHING) بھی کہہ سکتے ہیں۔ لاشئ بھی معرّیٰ عن القیود والشروط ہوتی ہے۔ لہٰذا ہیگل کی مایۂ ناز تصنیف "لاجک" (LOGIC) کا پہلا قضیہ یہ ہے کہ "وجود اور عدم وجود دونوں عین یک دگر ہیں"۔ ۱؎

ہیگل کے فلسفیانہ نظام میں اس کے فلسفۂ واجب الوجود کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اسی کی پیچیدگی کی وجہ سے اس کے بعض شاگردوں مثلاً اسٹراس، فیورباخ، برونو باؤر، اور کارل مارکس نے خدا کا انکار کر دیا اور انکارِ خدا کے بعد انکارِ مذہب دوسرا اور لازمی قدم ہے۔ اس کا فلسفۂ واجب الوجود حسب ذیل ہے:۔

"الحق" (THE REAL) جوہر نہیں ہے بلکہ عمل (PROCESS) ہے"۔ اب اگر الحق یا واجب الوجود کوئی جوہر یعنی کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے بلکہ محض ایک عمل کا نام ہے، تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ کس کا عمل؟ اس کا جواب ہیگل نے تو واضح طور پر کہیں نہیں دیا مگر اس کی تمام تحریروں کو مدّنظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ المطلق یا الحق یا واجب الوجود کا عمل۔ اس پر ہم یہ اعتراض کریں گے کہ عمل کو تو کسی لمحے قرار نہیں ہے اور جو شے ہر دم متغیر ہے وہ واجب کیسے ہو سکتی ہے؛ کُلُّ متغیّرٍ حادثٌ۔ دوسرا اعتراض یہ کہ عمل تو عامل پر موقوف ہے۔ اس لئے الحق عامل ہے نہ کہ عمل ـــــ اگر کہا جائے کہ کائناتی عمل (WORLD PROCESS) ہی المطلق ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ عمل ذی شعور ہے کہ غیر آں؟ اگر ذی شعور ہے تو عمل نہیں ہے۔ بلکہ عامل ہے۔

۱؎ میرا خیال ہے کہ اقبال نے اسی حیرت انگیز قضیے کو پڑھنے کے بعد ہیگل کے فلسفے کو "طلسم" سے تعبیر کیا ہوگا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

؎ ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی

ہیگل کے ان شاگردوں نے جو بائیں بازو والے یا اصحاب الشمال کہلاتے ہیں اسی قضیے کو مدّنظر رکھ کر خدا کا انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ فلسفے میں خدا کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ موجود ہے کیونکہ ہر تعریف، دراصل تحدید اور تخصیص ہے اور محدود، خدا نہیں ہو سکتا۔

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی ہے سب کچھ جو کچھ کہا، تو ترا حسن ہو گیا محدود

(اصغر گونڈوی)

اس صورت میں ہیگل کا دعوٰے باطل ہو جائے گا۔ اگر وہ عمل، غیر ذی شعور ہے تو۔

(۱) کائنات میں نظم و نسق کیسے پیدا ہو گیا ؟

(۲) ہم ذی شعور ہیں اس لئے غیر ذی شعور کو الحق کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں ؟ ہم اپنے آپ کو الحق کیوں نہ قرار دیں ؟

(۳) ذی شعور افراد، غیر ذی شعور عمل سے کیسے ظاہر ہو گئے ؟

ہیگل کے بعد

ہیگل کی وفات کے بعد اس کے شاگرد دو طبقوں میں منقسم ہو گئے۔ (۱) مذہب کے حامی یعنی دائیں بازو والے (RIGHTISTS) (۲) مذہب کے مخالف یعنی بائیں بازو والے (LEFTISTS)۔

(۱) مارکس اور اینگلز نے جدلیت کے تصوّر کو ہیگل سے مستعار لیا اور اس پر اپنے معاشی نظام کا قصر تعمیر کر دیا۔

(۲) ہیگل نے کہا کہ حقیقت کبریٰ یا اصل الاصول روح ہے۔ مارکس نے کہا کہ حقیقت کبریٰ یا اصل الاصول مادّہ ہے۔ اسی لئے ایک موقع پر اس نے طنزاً کہا تھا کہ میں نے ہیگل کے فلسفے کو جو سر کے بل تھا معکوس کر کے صحیح کر دیا، کیونکہ مادّہ، شعور کی پیداوار نہیں ہے بلکہ شعور یا نفسِ مُدرک مادّے کی پیداوار ہے۔

جدلیاتی مادّیت (DIALECTICAL MATERIALISM) پر تین پہلو سے بحث کی جاسکتی ہے (۱) جدلیت خواہ مادی ہو یا روحانی، صحیح ہے یا نہیں (۲) مادیت صحیح ہے یا نہیں ؟ (۳) مادی جدلیت نے مظاہر کی جو تشریح کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں ؟

بنیادی اعتراض شعور، سماجی یعنی مادّی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ حالات کے بدلنے سے شعور بدل جاتا ہے۔ (یہاں "ابدی اقدار" نہیں ہیں) تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ فلسفۂ جدلیت ایک ابدی یا دائمی صداقت ہے ؟ کیونکہ حالات کے بدلنے سے یہ فلسفہ بھی بدل جائے گا۔

© rasailojaraid.com

ہیگل کی جدلیت پر اعتراض : (جسے مارکس نے تسلیم کر لیا) دعویٰ (THESIS) اور ضدِ دعویٰ (ANTI - THESIS) سے ہیگل کی مراد کیا ہے ؟ آیا وہ حقائق مراد ہیں جو متضاد ہوتے ہیں یا وہ حقائق مراد ہیں جو متناقض ہوتے ہیں ؟ اگر یہ جواب دیا جائے کہ دونوں مراد ہیں تو جدلیت ختم ہو جائے گی اس لیئے کہ متناقض حقائق دعویٰ (THESIS) اور ضدِ دعویٰ (ANTI - THESIS) تو ہو سکتے ہیں مگر ان سے تالیف و ترکیب (SYNTHESIS) کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا ۔

دوسرا اعتراض : اثبات ، نفی اور نتیجہ کا ربط باہمی کیا ہے ؟ اس تعلق کی دو صورتیں ممکن ہیں :

پہلی یہ کہ اثبات اور نفی کو دو جداگانہ وحدتیں (UNITS) مانا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ اثبات اور نفی میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے پیدا نہیں ہوتا ۔ ہاں ان کے تصادم سے تیسری حقیقت یعنی نتیجہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن اثبات و نفی کو دو ایسی وحدتیں مان لینا جو ایک دوسرے سے پیدا نہیں ہوتیں ، ہیگل کے فلسفے کو منہدم کر دیتا ہے ۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہیگل کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کبریٰ کسی ایک وحدت کو مانتا ہے ۔ لہٰذا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں وحدتیں تیسری وحدت یعنی حقیقتِ کبریٰ سے پیدا ہوتی ہیں ۔ کیونکہ اس صورت میں ہم یہ سوال کریں گے کہ حقیقت کبریٰ اثبات یا نفی میں سے کون سی وحدت ہے ؟ (کسی ایسی وحدت کا تصور محال ہے جو اثبات و نفی دونوں سے خارج ہو) ۔

اگر ہیگل کے متبعین ، اثبات اور نفی میں سے کسی ایک وحدت کو حقیقتِ کبریٰ قرار دیں ، جس سے دوسری وحدت پیدا ہوتی ہو اور دونوں سے نتیجہ پیدا ہوتا ہو وقس علیٰ ذٰلک تو یہ صورت بھی خلافِ عقل ہے کیونکہ اثبات جب تک اثبات ہے اس سے نفی پیدا نہیں ہو سکتی ۔ اور نفی جب تک نفی ہے اس سے اثبات پیدا نہیں ہو سکتا ۔ مثلاً الیکٹران اور پروٹان (جو نیوٹران سے مل کر ایٹم کو بناتے ہیں) ، آپس میں مل تو سکتے ہیں مگر ان میں سے کوئی ، دوسرے سے پیدا نہیں ہو سکتا ۔

چوتھا اعتراض : تاریخ کے مادی تعبیر کے اخلاق کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ تاریخ کی غیر بینا اور مادی مشین میں غایت یا مقصد کا کوئی تصور موجود ہے ۔ تو ایسی دنیا

اخلاقی اصول پر مبنی سماج کیوں کرنے کے درپے ہے جس میں ظلم کے بجائے انصاف ہو گا؟
پانچواں اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ مادی کائنات بذاتِ خود عدل و انصاف کیلئے کوشاں ہے یعنی یہ صفت مادّے کی ذات میں داخل ہے تو پھر پیروانِ مارکس ایسی غیر طبقاتی سماج (CLASSLESS SOCIETY) کے لئے کیوں سعی کر رہے ہیں، یہ کام تو خود بخود ہو کر رہے گا؟ ہمیں جان کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ تاریخ اپنا فرض خود انجام دے گی یعنی ایک زمانہ خود بخود آجائے گا جب دنیا میں عدل و انصاف قائم ہو جائے گا۔

ہیوم، کانٹ اور ہیگل کے افکارِ پریشاں کا منطقی نتیجہ بیسویں صدی میں فلسفۂ مظہریت (PHENOMENALISM) اور فلسفۂ وجودیت (EXISTENTIALISM) کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ دونوں فلسفے دراصل مہایان بدھ مت کے دو اصولی یا بنیادی عقائد کی تعبیرِ جدید ہیں۔

(۱) پہلا عقیدہ یہ ہے کہ سَروم دکھم یعنی یہ کائنات سراسر دکھ، اذیت اور الم ہے اور یہی عقیدہ فلسفۂ وجودیت کا سنگ بنیاد ہے۔

(۲) دوسرا عقیدہ جس کا سب سے بڑا شارح نگارجُن ہے، یہ ہے کہ صرف مظاہر کا وجود ہے لیکن ان کے پس پردہ کوئی حقیقت مخفی نہیں ہے۔ نگارجن کا یہ نظریہ شونیے واد کہلاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں جرمن فلسفی ہسرل (HUSSEREL) نے اسی پرانی شراب کو نئی بوتل میں پیش کیا ہے۔

اور میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے تمام مدارسِ فکر قدیم ہندی مدارسِ فکر کی صدائے بازگشت ہیں:

الغرض

فشٹے (FITCHE) نے کانٹ کے فلسفے کو تصوریت میں تبدیل کر دیا۔ اس نے کانٹ کی " THING IN ITSELF " شی کما ہو کو دائرۂ ذہن میں محصور کر دیا۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ تمام حقیقت 'الیغو (EGO) کی فعلیت کا ثمرہ یا نتیجہ ہے، اور الیغو اپنی ماہیت کے

© rasailojaraid

.com

اعتبار سے فاعل ہے اور محدود ایغو یعنی معروض خویش ایک غیر مشخص ایغو کا (PRODUCT) نتیجہ یا ثمرہ ہے۔ وجود کا منبع مطلق ہے۔ فشٹے نے خدا کو " کائنات کے اخلاقی نظام " کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یعنی اسے خدا کا نعم البدل قرار دیا۔

شیلنگ (SCHELLING) نے فشٹے کے اس تصورِ مطلق میں جزوی تبدیلی پیدا کی، جو تمام جزئیات (جزئی ہستیوں) کی اصل ہے۔ اس نے موضوع اور معروض کا فرق مٹا دیا اور کہا کہ کائنات (معروض) اور ذہنِ مُدرک (موضوع) عین یک دگر ہیں باعتبارِ ذات واصل خویش۔ فطرت کا علم کیا ہے؟ فطرت کا شعورِ ذات حاصل کرنا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اس مفروضہ " مطلق " کے بارے میں یہ کس طرح تسلیم کرلیں کہ وہ مطلق بھی ہے اور ہمارے شعور کا معروض بھی ہے یعنی محدود بھی ہے۔ بقول اکبرؔ ؎

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا!

شیلنگ نے اس دشواری کو حل کرنے کے لئے " عقلی وجدان " کی قوتِ مخفیہ کو تسلیم کیا ہے جس کی مدد سے نفسِ مُدرک شعور کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے اور ذاتِ بے چون وبےچگوں کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ گویا معمائے کائنات کو حل کرنے کے لئے فلسفی شیلنگ صوفی شیلنگ بن جاتا ہے۔ سچ کہا اکبرؔ نے ؎

یہ عشق ہی ہے کہ منزل ہے جس کی الا اللہ　　خرد نے صرف رہِ لا الٰہ پائی ہے!

ہیگل نے شیلنگ کے اس ربطِ فکر کو تسلیم (قبول) کرلیا جو مطلق اور نفسِ مُدرک کے مابین پایا جاتا ہے۔ لیکن اس نے شیلنگ کے اس طریقِ استدلال کو تسلیم نہیں کیا جس کی مدد سے اس نے محدود اور غیر محدود کے مابین خلیج کو پاٹنا چاہا تھا۔ یا توافق پیدا کرنا چاہا تھا۔

ہیگل نے اس طریقِ عمل (PROCESS) کو واضح کرنے کا بیڑا اٹھایا جس کے وسیلے سے ساری کائنات لازماً ارتقاء پذیر ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ فکر اور وجود عین یکدگر ہیں افکار ہی اشیاء ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی کا وجود نہیں ہے۔ یہ کائنات تصورات کا ایک سلسلہ ہے۔ ہیگل کی رو سے یہ کائنات بشمول خدا و فطرت وانسان، تصورات کے ایک سلسلے کی شکل میں متبدل ہو جاتی ہے۔ یہ تصورات بذاتِ خویش ارتقائی منازل طے کرتے ہیں اور تمام حقیقت پر حاوی

om

ہیں۔ان سے باہر کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس ہمہ گیر محیط کل سلسلے میں اشیائے محسوسہ بحیثیت تصوّرات اپنا مقام متعین کرتی ہیں۔ اشیاء کا تعین بحیثیت تصوّرات ہوتا ہے۔ یہ عالم عامیوں کا نہیں ہے۔ خالص فلسفیوں کا ہے۔ اور یہ فلسفیانہ زاویۂ نگاہ، شعور کے ارتقاء کی آخری منزل ہے۔ فلسفی ہی کے شعور میں خدا (جو مطلق ہے) اپنا شعورِ ذات حاصل کرسکتا ہے۔

ہیگل نے عیسائیت کو نیا لباس عطا کیا، جو اس کے ذہن کا تراشیدہ تھا۔ چنانچہ اس نے تثلیث کا مفہوم یہ بیان کیا کہ ایک تو المطلق بذاتِ خویش ہے یا مرتبۂ ذات کے اعتبار سے ہے یہ المطلق، باپ ہے۔ پھر یہی المطلق، عالم معقول میں ظاہر ہوتا ہے یعنی بیٹا بن جاتا ہے۔ پھر یہی المطلق فلسفے ذات میں واپس آجاتا ہے یعنی روحِ قدس کہلاتا ہے (دوست خود گام می زنند)

ہیگل کی وفات کے بعد اس کے متبعین دو جماعتوں میں منقسم ہوگئے (۱) اصحاب الیمین (RIGHTISTS) اور (۲) اصحاب الشمال یا (LEFTISTS) (۱) نے ہیگل کے فلسفے میں اقرارِ خدا کے رنگ کو قائم کیا مگر جب STRAUSS نے "LEBEN JESU" شائع کی تو (۲) کا رنگ نمایاں ہوگیا یعنی خدا کا انکار اس فلسفے کی خصوصیت بن گیا۔

اس سلسلے میں فیور باخ اور کارل مارکس نے عیسائیت پر کاری ضربیں لگائیں۔ اگر اسٹراس نے یسوع کو ختم کیا تو ایف سی بور (F.C. BOUR) نے عہدِ جدید N.T کا قل پڑھ دیا اور فیور باخ نے "ESSENCE OF CHRISTIANITY" لکھ کر عیسائیت ہی کا خاتمہ بالخیر کردیا۔

اسٹراس، بور، اور فیور باخ نے پادریوں کی ذہنیت کو بے نقاب کیا اور مارکس نے مذہب کو افیون قرار دیا ——— واضح ہو کہ ہیگل کے فلسفے میں خدا شخص نہیں ہے بلکہ ایک وجودِ مطلق ہے "لاشرط شی" کے مرتبے میں۔ نیز شخصی بقائے روح کا تصوّر بھی خارج از بحث ہے۔ اس لئے ہیگل نے دراصل مذہبِ عیسوی کو ختم کردیا۔ لیکن ہیگل کا کمالِ فن یا طلسم یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں عیسوی کا حامی سمجھا جاتا تھا اور اس نے عیسائیت کو "کامل مذہب" قرار دیا ہے۔

●●●

© rasailojaraid.com

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : آئینۂ پرویزیت (مکمل مجموعہ چھ حصوں میں)

مؤلف : عبدالرحمن کیلانی

ناشر : مکتبہ السلام وسن پورہ، لاہور ۔ کل تعداد صفحات: ۹۸۴ مجموعی قیمت : ایک سو ایک روپیہ

دینِ اسلام اور امتِ مسلمہ کو اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ اندر سے اٹھنے والے فتنوں سے بھی بکثرت واسطہ پڑا ہے۔ ان فتنوں میں سے ابتدائی دور میں سبائیت، شیعیت اور خارجیت ــــ وسطی ادوار میں اعتزال، باطنیت اور اسماعیلیت اور عصرِ حاضر (ماضی قریب) میں قادیانیت، بہائیت اور پرویزیت خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض کا اختلاف چند مخصوص کلامی مسائل تک محدود تھا۔ (مثلاً معتزلہ) اور بعض نے جرأت سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو اسلام سے الگ ایک مستقل دین کے پیروکار (غیر مسلم) قرار دے لیا (مثلاً بہائیت) اور اکثر نے اپنے آپ کو ہی "اصلی اسلام" کے علمبردار سمجھ لیا ــــ تاہم "دینِ اسلام" کو اپنی خواہشات کے تابع بنانے اور مسلمانوں کے مسلمات پر حملہ آور ہو کر ان میں تشتت اور افتراق پیدا کرنے کی حد تک یہ سب "ملتِ واحدہ" قرار دیئے جا سکتے ہیں اور کئی لحاظ سے ان میں سے بعض کے ڈانڈے بعض سے ملتے بھی ہیں۔ "پرویزیت" (یا فکرِ پرویز) کے سوتے بلحاظ استدلال اعتزال اور باطنیت کے ساتھ اور بلحاظ مقاصد اشتراکیت اور مغربیت (سے مرعوبیت) سے جا ملتے ہیں ــ جناب غلام احمد پرویز اس فکری "گورکھ دھندے" کے بانی اور موجد تو نہیں تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے مذکورہ بالا ورثے کو، کسی ٹھوس علمی قابلیت کی بنا پر نہیں، بلکہ اپنی خداداد صحافی قابلیت کے زور پر اتنی ترقی دی کہ ان کی لفظی بازی گری اور ادبی صیقل گری سے بعض لوگوں کو ان کے پیتل میں بھی سونے کی چمک نظر آنے لگی ــــ خصوصاً ان حضرات کو جو قرآن کریم کو براہ راست